قانونی اساس کے لحاظ سے قرآن کریم کی ابدیت

ـــــــــــ ڈاکٹر فضل الرحمٰن

ہر مسلمان قرآن کو کلام الٰہی مانتا ہے اور اس کو ابدی صداقت کا حامل جانتا ہے۔ زمانۂ حال کے کچھ افراد کو چھوڑ کر سب مسلمان اس پر متفق ہیں اور رہے ہیں کہ قرآن نہ صرف اخلاق و عبادات کا ماخذ ہے بلکہ اسلامی قانون کی اساسِ اوّل بھی یہی ہے۔ لیکن دورِ حاضر کے کئی با اثر افراد نے قرآن (اور سنت نبویؐ) کو اساسِ قانون ماننے سے انکار کر دیا ہے اور غیر مذہبی قانون کے نظریہ کو اپنا لیا ہے۔ اس فکر کی تہہ میں جو خیال کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ معاشرے بدلتے رہتے ہیں اور معاشرے کے ساتھ ساتھ لامحالہ قانون کو بدلنا چاہیئے۔ لیکن قرآن کے قوانین کو اگر فی الواقع قوانین بھی تسلیم کر لیا جائے اور ابدی بھی تو معاشرے کی تغیرات پر ان کا انطباق محال ہے۔ لہٰذا نجات کی واحد صورت یہی سوچی گئی کہ قرآن کو اساس ماننے سے قطعی انکار کر دیا جائے۔

اس نظریے میں جتنی قوت ہے اس کا احساس مسلمانوں کو بظاہر نہیں ہے۔ اس نظریے نے پورے رسمی طور پر تو صرف ترکی میں جگہ بنائی ہے لیکن دیگر مسلمان ممالک میں بھی اس کے حامی بکثرت موجود ہیں۔ اگر دیگر ممالک میں اس نظریے کو کھلم کھلا اپنایا نہیں گیا تو اس کی وجہ صرف یہی

ہے کہ حکومتیں جانتی ہیں کہ علماء اور اکثر لوگ اس موقف کے شدید مخالف ہوں گے اور نوبت باہمی جدال و قتال تک پہنچ جائے گی۔ ان ممالک میں ایک کثیر تعداد ایسے تجدید پسندوں کی ہے جو قرآن کو اساسِ قانون اپناتے ہوئے تغیر حالات کے پیش نظر نیا اسلامی قانون مرتب کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ قرآنی تعبیر جدید کی کوئی ایسی خاطر خواہ صورت نہیں پیدا کرسکے جو ایک طرف قرآن کی ابدی صداقت کو بھی اپنائے اور دوسری طرف تبدیل پذیر معاشرے کی حقیقتوں کے ساتھ بھی انصاف کرسکے۔ لہذا ان کی تگ و دو بیشتر اسی تک محدود رہتی ہے کہ اکّا دکّا قانونی آیات قرآنی کو نئے نئے معنی پہنائیں اور نئی نئی تشریحیں کریں جو بسا اوقات لغت اور تاریخ کے حقائق کے ساتھ متصادم ہوتی ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو غیر مذہبی (سیکولر) نظریۂ قانون میں اتنی ہی قوت و شدت ہے جتنی قرآنی ابدیت کے روایتی تعبیر کے مسلک میں جس پر علماء اور ان کے ہم خیال سختی سے جمے ہوئے ہیں۔ روایتی مسلک کے حامی روایت پرستی میں جس قدر غلو برتتے ہیں اسی قدر تجدد پسند اصحاب کا ردّ عمل شدید ہوتا ہے۔ روایت پسند لوگ کہتے ہیں کہ جو چیز قرآن اور سنّت میں "منصوص" ہو چکی ہے وہ تو کسی حال میں بھی معاشرے کے تغیرات کے ساتھ ساتھ "تبدیل" نہیں کی جاسکتی (اگرچہ ان میں سے اکثر تو ایسے حضرات ہیں جو فقہ کو بھی ناقابل تبدیل سمجھتے ہیں) لیکن چونکہ معاشرے میں طرح طرح کی تبدیلیاں ناگزیر ہیں جن کے ساتھ ساتھ اربابِ حل وعقد کو چلنا لازمی ہوتا ہے (اس لئے کہ اربابِ اقتدار کا سروکار کتابی مسائل سے نہیں بلکہ زندگی کی ٹھوس حقیقتوں سے ہوتا ہے) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جلد یا بدیر قرآنی ابدیت کی اس روایتی تعبیر کے حاملوں کے ہاتھوں تنگ آکر یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ قانون کو اصلاً مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ بنا بریں غیر مذہبی نظریۂ قانون کی اولین ذمہ داری ان لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں۔ اور قرآنی ابدیت کی روایتی تعبیر کے حامل ہیں اور اس کے علاوہ کوئی اور تعبیر ممکن نہیں سمجھتے۔

اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کرسکتے ہیں۔

قرآن نے روزِ اول سے ہی اقتصادی عدل پر زور دینا شروع کیا تھا۔ مکّی دور میں خیرات،

صدقات اور زکوٰۃ کا جابجا اور تاکید کے ساتھ ذکر ہے۔ مدینہ میں جب پہلی بار مسلمان اپنی مستقل ریاست تشکیل کرنے کے قابل ہوئے تو زکوٰۃ کو باقاعدہ ٹیکس کے طور پر عائد کیا گیا۔ نماز اور زکوٰۃ کا جابجا اکٹھا ذکر قرآن نے کیا۔ زکوٰۃ کے مصارف جو قرآن نے گنائے ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد قرآن کی یہ تھی کہ سماجی بہبود کا کام ہو اور ٹیکیشن کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایک رفاہی ریاست اور عوامی بہبود پر مبنی معاشرہ قائم کیا جائے۔ زکوٰۃ کی شرح سرمایہ پر اڑھائی فی صد لگائی گئی۔ اس سے یہ یقینی علم ہوا کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں یہ شرح اس معاشرہ کی رفاہی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ لیکن رسول اکرمؐ کے بعد جتنے مزید ٹیکسوں کی ضرورت پڑتی رہی ان کو خارج از زکوٰۃ سمجھا گیا۔ اور زکوٰۃ کی شرح کو "منصوص" سمجھ کر اس سے تجاوز کرنا دینی طور پر ناممکن سمجھا گیا۔

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ قرآن کریم اور رسول اکرمؐ نے (دیگر اختیاری نفلی صدقات کے علاوہ) رسمی ٹیکس صرف زکوٰۃ ہی لگایا تھا۔ یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ اس واحد رسمی ٹیکس کی علتِ غائی معاشرہ کی بہبود تھی۔ ان دونوں باتوں سے یہ لازم آتا ہے کہ اس زمانے کے معاشرے اور اس کی معاشرتی بہبود کی ضروریات کے لئے یہ فی الجملہ کفایت کرتا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ معاشرے کی بہبود کی ضروریات بہت زیادہ ہیں تو ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جو بھی رسمی ٹیکس مسلمانوں پر عائد کیا جائے وہ زکوٰۃ کیوں نہ ہو؟ جب یہ سوال اٹھایا جاتا ہے تو روایتی موقف کے ترجمان فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کی شرح کو بالکل تبدیل نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک مسلمان حکومت کو ہر وقت حق حاصل ہے کہ اگر زکوٰۃ کافی نہیں تو دیگر ٹیکس عائد کر دے۔ اس جواب پر جدید سیاسی صاحبِ اقتدار کچھ اس طرز پر سوچتا ہے کہ "اس طرح ٹیکیشن میں غیر ضروری دوئی پیدا ہو جائے گی۔ ایک طرف تو ایک "خالص اسلامی" ٹیکس معاشرے کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے دوسری طرف دیگر قسم کے ٹیکس عائد کرنے پڑتے ہیں" جب معاملہ یہاں تک طول کھینچتا ہے تو تجدد پسند سامنے آتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر واقعی زکوٰۃ کو فعّال بنانا ہے اور اس سے اس کا بنیادی مقصد یعنی ایک رفاہی معاشرہ کا قیام حاصل کرنا ہے تو زکوٰۃ کی شرح میں تبدیلی ضروری ہے۔ اس تبدیلی کے بغیر زکوٰۃ کا مقصد فوت

ہوجاتا ہے۔ لہذا اب رفاہی معاشرے کے قیام کے لئے جو ٹیکس مسلمان دے گا وہ زکوٰۃ ہوں گے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر قرآن اور رسول اکرمؐ کا مقصد زکوٰۃ سے رفاہی معاشرے کا قیام تھا اور اگر آج فرض کرو اس کے لئے دس یا پندرہ فی صد ٹیکس ضروری ہے تو اگر رسول اکرمؐ اب موجود ہوتے تو وہ یقیناً یہی شرح مقرر فرماتے۔ اس لئے اگر ایسا نہ کیا جائے تو اسلام ناقابل عمل ہوجاتا ہے اس پر روائتی موقف کا نمائندہ متجدد سے کہتا ہے کہ تم اسلام کو تبدیل کرنے پر اتر آئے ہو۔ زکوٰۃ اور اس کی "منصوص" شرح میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ اور ٹیکس عائد کئے جاسکتے ہیں۔ اس جدال میں لبا اوقات سیاسی صاحب اقتدار جسے بہر حال معاشرے کی اصلاح کا عملی اور سنگین مسئلہ پیش نظر رہتا ہے روایت پسندانہ اور متجددانہ دونوں موقفوں کے حامیوں کو ترک کرکے غیر مذہبیت کی راہ لیتا ہے۔

اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے؛ یعنی اسلام کو میدان حیات سے دور کرنے اور ناقابل عمل بنانے اور غیر مذہبیت کو برپا کرنے کا حقیقی ذمہ دار کون ہے؟ کیا وہ شخص نہیں ہے جو بزعم خود "منصوص" پر اڑا ہوا ہے اور یہ بھولا ہوا ہے کہ ان نصّی احکام کا ایک خاص پس منظر، خاص حالات اور خاص گرد وپیش سے ربط ہے اور یہ کہ درحقیقت ان نصّی احکام کی جان ان کی علّت غائی اور ان کا مقصد ہے اور یہ کہ چاہے حالات کچھ ہوں نص پر سختی سے اڑے رہنے سے علّت غائی اور مقصد حقیقی فوت ہوجانا یقینی ہے؛ ہم نے صرف ایک مثال "زکوٰۃ" کی لی ہے ورنہ پورے اجتماعی فقہی مسائل میں صورت یہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے پہلی ڈھائی تین صدیوں کے بعد جب ایک فقہ کا نظام (جسے شریعت کا لقب بھی دیا گیا) مرتب کیا تو اس سے آگے نہ بڑھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعد میں سلاطین اور سیاسی اصحابِ اقتدار نے اپنے قانون بنائے اور فرامین جاری کرنے شروع کر دیئے علمائے خود ان کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔ اپنے روایتی ورثہ میں علماء کوئی معتدبہ تبدیلی کرنے کو تیار نہ تھے کیونکہ یہ "شریعت میں مداخلت" تھی۔ اس لئے انھوں نے "شریعت" کو تو مضبوطی سے پکڑے رکھا لیکن زمین ان کے پاؤں تلے سے نکلتی گئی۔ اصحابِ اقتدار کو چونکہ حقیقی مسائل حل کرنے تھے اگر ان کا جواب "شریعت" میں نہیں تھا تو قدرتاً انھیں اپنے "قانون" نافذ کرنے تھے۔

یہ معاملہ دولت عثمانی میں خاص طور پر تقریباً ایک رسمی پیمانے پر چل نکلا۔ سلطانی "قانون" کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا لیکن شریعت کے ترجمان اپنی جگہ پر اڑے رہے اور شریعت کی کوئی نئی تعبیر کرنے کے مخالف رہے۔ جب نیا دور آیا تو نئے ارباب اقتدار نے سوچا (اور وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب تھے) کہ اہل شریعت تو فقہ کی کوئی معتدبہ نئی ترجمانی اور تعبیر نہیں کریں گے۔ کیونکہ انھوں نے تو اپنا راستہ مدت سے مسدود کر رکھا ہے۔ لہذا قانون میں "دوئی" کی کیا ضرورت ہے! کیوں نہ ہم صرف قانون ہی باقی رکھیں جس کی نئی تعبیرات بوقت ضرورت بالکل ممکن ہیں۔ اور فقہ یا شرعی قانون کو بالکل جواب دے دیں کیونکہ اس نے خود ہی مدت سے جواب دے رکھا ہے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ روایتی موقف کا نمائندہ جو تجدّد پسند کو "اسلام کو تبدیل کرنے" کا طعنہ دے کر کہا کرتا تھا۔

بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو

اور اپنے آپ کو قرآن اور سنّت کا علمبردار سمجھتا تھا بنظر غائر دیکھنے پر اسلام کو معطل کرنے اور زندگی کی رَو سے بے دخل کرنے کا حقیقی ذمہ دار نکلا — وقال الرسولُ یارَبِّ انّ قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً —

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
جو میں بتکدے میں بیاں کروں تو صنم پکارے ہری ہری

حقیقت یہ ہے کہ اس پورے المیہ کی بنیاد (جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں قرآن کی ابدیت کی روایتی تعبیر ہے جو قرآنی وحی (اور سنّت) میں حالات زمانہ اور گرد و پیش کے پس منظر کو ذرہ بھر اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ایسا کرنا (باوجود اس کے کہ وہ شان نزول کے قائل ضرور ہیں)، اس موقف کے حامیوں کے نزدیک قرآن کو مقامی اور زمانی بنا دے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایتی موقف کا حامی خود قرآن کو بالکل مقامی اور زمانی بناتا ہے۔ کیونکہ جب وہ اصرار کرتا ہے کہ قرآنی احکام کے دائرۂ عمل کے علاوہ ان احکام کا تاریخی اور سماجی پس منظر بھی دائمی ہے تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ تاریخ کو آگے نہیں بڑھنا چاہیئے بلکہ تاریخ اور سماجی ردش کو قرآنی وحی کے ہمعصر عرب سماج کے تاریخی ڈھانچے پر رک جانا چاہیئے۔ اور چونکہ تاریخ اس کے روکے سے رکتی نہیں اور

زندگی کا دھارا برابر بہتا چلا جا رہا ہے۔ اور وہ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل کو من وعن ابدالآباد تک دہراتے رہنے سے قاصر ہے لہذا اس نے حال اور مستقبل میں بسنے کے بجائے ماضی میں بسنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے دور کا ہم عصر نہیں رہا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بالمقابل متجدد کہتا ہے کہ قرآن حکیم کے احکام کو بڑی گیرائی کے ساتھ ان کے تاریخی اور سماجی پس منظر کے پیش نظر سمجھنے کی کوشش لازمی ہے ـــــ اس طرح قرآنی احکام کے علل کا استخراج پوری ذمہ داری سے کر کے ان علل کی اساس پر ماضی کی روشنی میں ایک نیا مستقبل تعمیر کیا جائے۔ یہ حقیقی معنی ہیں قرآن کو عملی جامہ پہنانے کے۔ اگر متجدد کامیابی سے یہ کام سرانجام دے سکے تو وہ نہ صرف اپنے دور کا ہم عصر ہو سکتا ہے بلکہ ایک شاندار اور مثبت اسلامی مستقبل کا خالق بھی۔ قرآنی ابدیت کی روایتی تعبیر ایک اور راہم روایتی موقف کے ساتھ ٹکراتی ہے اور اس کا بظاہر کوئی حل نہیں۔ قرآنی ابدیت کی روایتی تعبیر کے مطابق قرآنی احکام کو من وعن بمع تاریخی اور سماجی پس منظر کے ابدیت حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ناسخ اور منسوخ کے بھی قائل ہیں یعنی اس بات کے کہ قرآن میں خدا نے کچھ احکام دیئے ہیں اور بعد میں ان کو منسوخ کر کے ان کی جگہ تازہ احکام نافذ کئے ہیں۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ خدا نے ایسا کیوں کیا تو اس کا سوائے اس کے اور کوئی معقول جواب نہیں کہ خداوند تعالیٰ نے پہلے حالات کے پیش نظر کچھ احکامات دیئے بعد میں جب وہ حالات تبدیل ہو گئے تو اور احکامات دیئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا قرآنی وحی کے اختتام کے بعد حالات اپنی جگہ پر ہی جمے رہے ہیں؟ جب یہ سوال اٹھایا جائے گا تو روایتی موقف کا ترجمان صرف ایک ہی بات کر سکتا ہے کہ اگرچہ حالات تو بدلے ہیں لیکن چونکہ کوئی اور وحی نازل نہیں ہوئی جو نئے احکام صادر فرمائے۔ اس لئے قرآن کے اندر جو "ناسخ" احکام موجود ہیں خدا کی رضا ان کے متعلق یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ابد الآباد تک جاری رہیں اور "الیوم اکملت لکم دینکم" الآیہ (سورۃ المائدہ - آیت ۳) کا یہی معنی ہے یہ جواب اتنا بدیہی طور پر فاسد ہے کہ اس کی تنقید کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ کی جانی چاہیئے۔

یہ بات کہ قرآنی وحی کے اختتام کے بعد کوئی وحی نہیں آئی نہ آئے گی، بالکل برحق ہے اور اس کے حق ہونے پر تاریخ خود شاہد ہے۔ لیکن نہ تو قرآنی ابدیت کی روایتی تعبیر اور نہ ناسخ ومنسوخ کا نظریہ اس مسئلہ کا کوئی حل ہے کہ قرآن حکیم کو عملی جامہ کیسے پہنایا جائے؟ قرآنی ابدیت کے روایتی تصور کو رد کرنے

کے دلائل ہم پہلے دے چکے ہیں لیکن یہ بات کہ روایتی موقف کو ناسخ و منسوخ کا نظریہ بھی اپنا نا پڑا ابدیت کے اس تصور کی ایک زبردست تردید ہے ۔ کیونکہ اگر خداوند تعالیٰ کو کچھ احکام نافذ کرکے پھر منسوخ کرنے پڑے تو آخر ایسا کیوں کرنا پڑا ؟ اور کیا ان پہلے احکام میں نزول کے وقت وحی الٰہی ہونے کے سبب ابدیت تھی یا نہیں اور کیا منسوخ ہونے پر وہ وحی الٰہی نہیں رہے کہ ابدیت سے معرّا ہو جائیں ؟ ابدیت کے اس تصور کی رو سے ناسخ و منسوخ کے مسئلہ پر ان سوالات کے اطمینان بخش جوابات دینا از بس ضروری ہے ۔ مثلاً مکہ میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم نہ تھا بلکہ صبر کی تلقین تھی ۔ مکّی زندگی کے غالباً آخر میں وہ آیت اتری ہے جس میں حکم ہے کہ

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا	(تم اتنی ہی سزا دو جتنی کہ ایذا تم کو دی گئی ہو
عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ	یعنی کہ بس بدلہ لے لو اور زیادتی نہ کرو
خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (النحل، آیت ۱۲۶)	اور پھر بھی صبر کرو تو بہتر ہے)

مدنی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد ہی جہاد کا اذن ملا ۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نئے احکام مکّی احکام سے مختلف تھے ۔ پھر خود جہاد کے بارے میں کئی مختلف احکام دیئے گئے ۔ لیکن کیا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ قرآن کو من حیث المجموع علیٰ جامہ پہنانا لازمی ہے اور قرآنی احکام کو عمل میں لانے کا یہی واحد طریقہ ہے ۔ جہاں قرآن احکام دیتا ہے وہاں ان کے تاریخی اور سماجی پس منظروں کو دیکھنا اور ان کے پیش نظر علل الاحکام کا استنباط کرنا ضروری ہے ۔ اور چونکہ حالات لوٹ کر کبھی بھی اسی حالت پر نہیں آتے جیسے کہ بعینہٖ پہلے تھے تو ان علل الاحکام کو اب ہمارے نئے ماحول میں نئے پس منظروں کے ساتھ نافذ کیا جائے اور ان کو ایک نئی قانونی شکل دی جائے ۔

ناسخ و منسوخ کے مسئلہ اور قرآنی ابدیت کے روایتی موقف کے لئے جہاد کے یہ قرآنی احکام جن کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے ایک ناقابل حل سوال اٹھاتے ہیں ۔ لیکن باقی اقتصادی اور سماجی قوانین کا بھی یہی حال ہے ۔ یہی حال مثلاً موجودہ بنکنگ کا ہے جس کے متعلق ہم "فکر و نظر" میں پہلے لکھ چکے ہیں ۔